بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ط

ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی ؒ ☆

معراجِ انسانیت

یہ حقیقت کہ انسان میں اچھے اور برے رجحانات بیک وقت جمع ہوتے ہیں۔اس قدر پیش پا افتادہ ہے کہ اس کا اعادہ تحصیل حاصل معلوم ہوتا ہے۔اس کے باوجود انسان کی فطرت کو سمجھنے کے لئے اسے پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔نفسیات کے ماہر یہ جانتے ہیں کہ انسان کی جبلت میں تاریک اور تباہ کن خواہشوں کا ایسا اوقیانوس موجزن ہے کہ اگر اس میں قوت احتساب نہ ہوتی تو وحشی درندوں سے بھی زیادہ خوں خوار اور ان تمام خوبیوں سے عاری ہوتا جو انفرادی اجتماعی زندگی کی ضامن ہیں،جس قوت کو میں نے احتساب کہا ہے اس کے لئے انگریزی میں سینسر (Censor) اور اردو میں فوق الشعور کی اصطلاح وضع کی گئی ہے۔یہ احتساب کیا ہے؟اس کی بنیاد کن عوامل پر قائم ہے؟اس کی تعمیر کیوں کر ہوتی ہے؟اس کا فیصلہ کس حد تک قابل قبول ہونا چاہئے؟یہ کمزور کیوں پڑتا ہے۔یہ وہ سوال ہیں جو ہر ذی فہم کے ذہن میں ابھرتے ہیں،اور ان کے صحیح جوابوں پر اس کے کردار کی تعمیر ہوتی ہے،یہ ممکن ہے کہ یہ سوال شعوری طور پر قرطاسِ احساس پر منقوش نہ ہوتے ہوں لیکن انسان کا کردار ان ہی سوالوں کے جوابات کا آئینہ دار ہوتا ہے۔

احتساب وہ قوت ہے جو انسانوں کو اپنی خواہشات پر پابندی لگانے پر مجبور کرتی ہے،وہ یہ بتاتی ہے کہ ہر اندھی خواہش پر عمل کرنا نامناسب ہوگا۔اگر یہ قوت احتساب نہ ہوتی تو اخلاق کا ضابطہ مرتب نہ ہوتا۔یہ قوت اس طرح پیدا ہوئی ہے کہ انسان اپنے طویل نوعی تجربے کی بنا پر یہ معلوم کر چکا ہے کہ ہر خواہش کی بلا روک ٹوک تکمیل سے انفرادی اور معاشرتی خرابیاں پیدا ہوتی ہیں،اور معاشرے کے انتشار سے وہ خود

☆۔سابق وائس چانسلر،جامعہ کراچی

بھی مجروح ہوتا ہے۔اس نوعی تجربے کے علاوہ جو حقیقتاً احتساب کی بنیاد ہے۔ایسے معاشرے کے عقائد و رواج اسے تقویت پہنچاتے ہیں۔جس میں وہ زندہ ہوتا ہے۔اگر یہ بات معقولیت کے ساتھ سمجھ میں آتی ہو کہ احتساب جس بات سے روکتا ہے وہ نوعی سماجی، یا انفرادی معار کے پیش نظر ممنوع ہونی چاہئے۔تو اس فیصلے کو قبول کرنا چاہئے۔

احتساب مسلسل بدعنوانیوں اور بغاوتوں سے کمزور پڑ جاتا ہے۔لیکن احتساب غلطی بھی کرسکتا ہے اگر معاشرہ مریض ہوتو انفرادی احتساب بھی مریض ہو جاتا ہے اور معاشرے کی خرابیوں کے خلاف اس کی قوت مدافعت کمزور پڑ جاتی ہے۔یہی سبب ہے کہ اکثر دانش وروں کی رائے میں ایک ضابطۂ حیات و اخلاق کی ضرورت ہے۔جو احتساب کے لئے کسوٹی کا کام کرے اور اسے صحیح راستے پر چلنے کی ہدایت کرے، جب احتساب ایک ایسے ضابطے کا پابند ہو جاتا ہے جو محض منفی اقدار سے آگے بڑھ کر مثبت قید کی صورت اختیار کر لے تو احتساب اور ضمیر میں ہم آہنگی پیدا ہو جاتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ تربیت یافتہ قوت احتساب کا نام ضمیر ہے۔انفرادی اعتبار سے معراج انسانیت یہی ہے کہ انسان خیر کا حامل ہو اور شر سے اس کا دامن پاک ہو، اجتماعی طور پر معراج انسانیت یہ ہے کہ ایک ایسا معاشرہ قائم ہو جو خیر کی ترویج اور شر کی بیخ کنی میں کوشاں ہو اور اس میں کامیابی بھی حاصل کر سکے، کوشش کا ذکر میں نے اس غرض سے کیا ہے کہ بغیر کوشش کے کامیابی حاصل نہیں ہو سکتی اور اگر ایک مرتبہ حاصل ہو بھی جائے تو قائم نہیں رہ سکتی۔وہ تمام خواہشیں اور قوتیں جو انسان کو ودیعت ہوتی ہیں۔ انسانی زندگی میں ایک مقام رکھتی ہیں۔اور کوئی نہ کوئی اہم کردار ادا کرتی ہیں۔وہ اس کی انفرادی اور نوعی زندگی کو برقرار رکھنے کے لئے ضروری ہیں، البتہ ان کے استعمال میں اعتدال شرط ہے اور ان کو کام میں لانے کے لئے بعض حدود مقرر کرنی پڑتی ہیں تاکہ وہ صحیح طور پر بروئے کار آ سکیں۔انسان کی ہر قوت ایک ایسی طاقت ہے جو تعمیر بھی کر سکتی ہے اور تخریب بھی، جو آب حیات بھی ثابت ہو سکتی ہے اور زہر ہلاہل بھی، معراج انسانیت یہی ہے کہ ان سب کو آب حیات بنا کر کام میں لایا جائے۔اب آپ اسلام کے ضابطۂ اخلاق پر نظر ڈالئے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ اس نے انسان کی کسی قوت کو شل کرنے کی ترغیب نہیں دی، بلکہ اس کے استعمال کا ایسا قاعدہ بتایا کہ بہتر سے بہتر خدمت انجام دے سکے۔زندگی میں اس کا وہی کردار ہو جو معاشرے کی تعمیر کے لئے ضروری ہے۔اسلام نے نہ تو اسے ترک کرنے کی تلقین کی جس سے اس کی افادیت ختم ہو جاتی، اور انسانی ذہن کے لئے الجھن اور اس کی

نوعی اور انفرادی زندگی کے لئے مشکلات پیدا ہو جائیں، نہ ایسی چھوٹ دی کہ انفرادی زندگی کا اعتدال اور معاشرے کا استحکام ختم ہو جائے۔ یہ توازن جو اسلام کے ضابطے کی جان ہے اور جو اس ضابطے کو دوسرے ادیان اور ضابطوں پر فوقیت دیتا ہے ایک طرف تو حکمت اور دانش کی معراج ہے، دوسری طرف فطرت شناسی اور جبلت آگاہی کا کمال ہے۔ اسلام معراج انسانیت کا مفہوم یہ نہیں سمجھتا کہ فرد اپنے آپ کو انفرادی، نوعی اور اجتماعی فرائض سے علیحدہ کر لے، یہی سبب ہے کہ وہ رہبانیت کو مکروہ اور فرار کو ناپسندیدہ قرار دیتا ہے۔ اس کا ضابطہ اس مرد مومن کی تربیت کرتا ہے جس کے لئے زندگی ایک نعمت ہے اور وہ اس کے ذریعے سے ایک مفید اور متوازن معاشرہ بناتا ہے اور پھر اپنی قوتِ ایمانی اور زور بازو دونوں سے اس کی حفاظت کرتا ہے۔

اس کے نزدیک حیات جدوجہد ہے، کارزار ہے، وہ پوشیدہ اور دانستہ قوتوں کو صحیح استعمال کے ذریعے سے بے دار کرنے اور ان کی تربیت سے جلا پاتی ہے، کمزور نہیں پڑتی۔ جو اس کارزار سے جی چرا کر ہمالیہ کی چوٹیوں یا سماعے کے زاویوں میں پناہ لیتا ہے، تو اسلام کا مرد مومن نہیں بن سکتا۔ پھر اسلام اس ازلی راز سے بھی پوری طرح آگاہ ہے کہ فرار سے جو ذہنیت پیدا ہوتی ہے وہ نہ انسانیت کی تعمیر کر سکتی ہے نہ اس کی حفاظت، معراج انسانیت کارزار حیات میں کامیابی کا نام ہے۔ اس کا نشان ظفر فتح مبین ہے۔ یا شہادت ہے، زندگی کو تج دینا اور رہبانیت کے اعلیٰ مقام پر پہنچنا نہیں ہے اور فتح کا ذکر آیا ہے تو فتح کس کے اوپر، جہاد جو اس کارزار کا ایک پرتو ہے وہ جہاد کس کے خلاف؟ مومن کا جہاد شر کے خلاف ہوتا ہے خواہ وہ اپنے نفس میں ہو یا معاشرے میں یا طاغوتی طاقتوں کے استیلا میں یا انسان پر ظلم کی مشکل میں اور ان سب کے خلاف بیک وقت جاری رہتا ہے، ایک ایک کے خلاف علیحدہ علیحدہ، باری باری سے نہیں بلکہ بیک وقت اس لئے کہ جہاد تو وہ عبادت ہے جو شرط عبودیت ہے۔ اس سے مومن کسی جگہ منہ نہیں موڑ سکتا۔

نفس کے خلاف جہاد کا صلہ تزکیہ نفس ہے جو تمام دوسری قوتوں کی تقویت کی بنیاد ہے۔

معاشرے میں شر کے مقابلے کا صلہ تطہیر معاشرہ ہے جس کے بغیر انسان کی اجتماعی قوتیں بیدار نہیں ہو سکتیں، طاغوتی قوتوں کا استیلا فرد اور معاشرے دونوں کے لئے پیغام موت ہے اور اس کے خلاف جہاد حیات نو کا پیغام اور اس میں کامیابی کا صلہ انفرادی اور اجتماعی قوتوں کی حیات نو ہے۔ اور ظلم کا مقابلہ ظالم اور مظلوم دونوں کی مجروح انسانیت کا مداوا ہے۔ اس میں کامیابی کا صلہ انصاف اور عدل کا قیام ہے جس کے بغیر انفرادی اور اجتماعی زندگی کے درمیان رشتہ قائم نہیں رہ سکتا۔ اگر اسلام کا ضابطۂ اخلاق وکردار حیات انسانی

کی تطہیر و عروج کا ضامن ہے تو وہ ذات گرامی جسے اس ضابطۂ حیات کو سکھانے کے لئے اسوۂ حسنہ بنا کر بھیجا گیا، انسانیت کے کس مقام پر جلوہ افروز ہے، وہ مقام تو وہی ہوسکتا ہے جہاں تک انسان پہنچنے کی برابر کوشش کرے تو قریب تر تو پہنچ سکتا ہے لیکن اس مقام کو حاصل نہیں کرسکتا اس لئے کہ وہ مقام انتہائے عروج ہے، وہ دوسرے انسانوں کے لئے خواہ وہ انبیا ہوں یا اصفیا سمت الرأس عروج تو ہے مقام عروج نہیں وہ معراج معراج ہے محض معراج نہیں، اللہ تعالی کی اس امر میں کیا مصلحت تھی کہ اس نے ایک انسان کو ایسے درجے پر پہنچایا کہ اس کا اتباع معراج انسانیت پر پہنچنے کا زینہ اور اس کے مقام کا صحیح ادراک اصل ایمان ہے، یہ نقطہ فلسفیانہ موشگافیوں سے بالاتر اور عرفان و آگاہی کی حدود میں داخل ہے، اسے صرف تشبیہ اور استعارے کی مدد سے بیان کیا جاسکتا ہے، اور تشبیہ و استعارے کا عجز بھی اہل دانش پر عیاں ہے، بہرحال اسے سمجھنے کے لئے اگر ہر امت کی زندگی کو ایک ندی کے بہاؤ سے مماثل سمجھا جائے تو آسانی ہوگی، اگر وہ ندی دائمی بہنے والی ہے اور محض برساتی نالہ نہیں ہے تو اس کا سرچشمہ بالعموم اس پانی سے زندگی پاتا ہے جو کوہستان کی چوٹیوں پر پڑی ہوئی برف جو پگھل پگھل کر بہم پہنچاتی ہے جب یہ ندی اپنے منبع سے روانہ ہوتی ہے تو اس کا پانی شفاف اور آلودگیوں سے پاک ہوتا ہے۔ اس میں ایک جوش ہوتا ہے جو پتھروں کو توڑتا اور گھستا ہوا ایک شور و خروش کے ساتھ بہتا ہے، اس وقت اسکی دلفریبی دیکھنے کے قابل ہوتی ہے وہ اپنا راستہ پہاڑوں اور وادیوں میں بناتی ہوئی چٹانوں سے ٹکراتی ہوئی، پتھروں سے اٹھکھیلیاں کرتی ہوئی چھوٹے بڑے سنگریزوں کو جلا کرتی ہوئی بالآخر مسطح علاقے میں پہنچ جاتی ہے اور پھر اس کی رفتار میں سکون پیدا ہوتا ہے۔ وہ اپنے دامن کو دوسری ندیوں اور نالوں کے لئے فراخ رکھتی ہے اور وہ آکر اس میں ملتے ہیں اور اس کی قوت کو بڑھاتے ہیں۔ جب تک یہ نالے صاف پانی لاتے ہیں ندی کا پانی مکدر نہیں ہوتا، لیکن پھر اس کو ایسے مقامات سے بھی گزرنا پڑتا ہے جہاں اسے بیسیوں خطرات درپیش ہوتے ہیں، مگر دو خطرے ایسے ہیں جن سے ندی کی افادیت کم ہوجاتی ہے۔ پہلا خطرہ تو یہ ہے کہ وہ کسی ایسے علاقے میں پہنچ جائے جہاں مزید ندی نالوں کی کمک نہ مل سکے اور ریگستان میں خشک ہوتے ہوتے اس کا وجود ہی ختم ہوجائے، اور دوسرا خطرہ یہ ہے کہ وہ ایسے علاقے سے گزرے جس کی کثافتیں اس کے پانی کی شیرینی اور صفائی کو ختم کردیں یہ خطرے ان ندیوں کو زیادہ پیش آتے ہیں جو کسی نیچے پہاڑ سے نکلتی ہیں، جہاں برف کی مقدار کم ہو اور یہ مقدار اس کی کفیل نہ ہوسکے کہ اسے کثافت و قلت آب کی بلاؤں سے بچاسکے، ندی کا پانی ہی اصل میں اس کی حیات ہے، اب آپ دنیا کی ان امتوں پر نظر ڈالئے جن کی زندگی کا سرچشمہ کم از کم ابتداءً ہدایت الٰہی تھا، کوئی بہہ

کراپنی تنگ مائیگی کے سبب کسی ریگستان میں جا کر معدوم ہوگئی، اور کوئی خارجی اثرات کی کثافتوں کی تاب نہ لاسکی، لیکن امت محمدیہ (ﷺ) کو چونکہ انسانیت و نبوت کی سب سے اونچی چوٹی سے آب حیات کی رسد پہنچتی رہی اس لئے وہ ریگستانوں کو گلزار بناتی ہوئی ان سے آگے نکل گئی اور اس کی تعلیمات کا سرچشمہ چونکہ وحی کے شفاف اور خالص ضابطے سے سیراب ہوا تھا اس لئے اگر ماحول کی کثافت نے اس پر غلبہ پانے کی کوشش بھی کی تو کامیاب نہیں ہوئی۔ غور فرمایئے کہ وہ کونسا دین ہے جس کی تعلیمات کا انحصار ایسی کتاب پر ہے جس میں لوح محفوظ پر ثبت ہونے سے آج تک یعنی ازل سے ابد کے اس نقطے تک جہاں آج انسانیت پہنچی ہے ایک نقطے کی تحریف نہ ہوئی ہو، یہ آب حیات ہم تک ایسی بلندترین ہستی کے طفیل ہی پہنچ سکتا تھا جس کا درجہ تمام انبیا علیہم السلام میں سب سے بلند ہے یہ مقام تو تمام انبیا کی تعلیمات کے تقابل سے ظاہر ہوتا ہے، دنیاوی فلسفیوں کی کیا مجال ہے کہ اس بلند مقام پر پہنچیں جہاں انبیاءؑ کی مشیت الٰہی کے ماتحت نہ پہنچ سکے۔

فلسفہ تو اپنے لنگ پا کی وجہ سے ایسی الجھنوں میں گرفتار رہا ہے کہ اس سے خود فلسفیوں کی بھی تشفی نہیں ہوتی اور اگر کسی ناقص فلسفے پر کسی معاشرے کی عمارت کھڑی بھی کی گئی تو اسے قائم رکھنے کے لئے بنیادی فلسفے میں روز افزوں تبدیلیوں اور تحریف کی ضرورت پیش آتی رہی۔

انسانی سیرت کے تین پہلو ہوتے ہیں جو اس کے ترکیب و تخلیق میں داخل ہیں ایک یہ کہ وہ اس عالم آب و گل میں ایک حیوان ہے جس دنیاوی زندگی کا انحصار اس کی مادی ضروریات کی تکمیل پر ہے۔ دوسرا یہ کہ وہ حیوان ناطق ہے جس کے باعث اس میں فکر و دانش کی صلاحیتیں مضمر ہیں اور جو نوعی تجربے اور تحقیقات کی بنیاد پر وسیع تر ہوتی جاتی ہیں، تیسرا یہ کہ یہ پیکر خاکی نوری تجلیات کا مورد بھی ہے، اور اس کی روح میں وہ تشنگی ہے جو نہ مادی ضروریات کے پورا ہونے سے بجھتی ہے نہ عقل و دانش کے عروج سے رفع ہوتی ہے، ابتدائے آفرینش سے آج تک اس نے یہ کوشش کی ہے کہ اس مادی ماحول سے ماورا کی کیفیات سے اپنے دامن کو بھر لے، یعنی انسان کی زندگی کو جسمانی، ذہنی، روحانی ضروریات پر مشتمل سمجھنا چاہئے اور ان تینوں کو جدا کرنا ایسا ہی ہے کہ گوشت کو پوست سے یا رگ جان کو جسم سے علیحدہ کر کے زندگی کے جاری رہنے کی امید رکھی جائے، جو عروج انسانی کی دسترس میں اب تک رہا ہے، وہ انہی تین طبقات سے متعلق رہا ہے، کوئی اگر جسمانی قوئی کی تربیت سے مشہور ہوا تو رستم داستاں بنا اور اگر کسی نے ذہنی ترقی کی تو وہ سقراط یا افلاطون یا ابن سینا کی ہمسری کا مدعی ہوا، کسی نے روحانی ترقی کی تو اس نے ریشیوں منیو کے آسن یا عزلت

نشین رہبانیت کے بورے پر بیٹھ کر نفس کشی کی منزلیں طے کیں اور اپنے جسم کو اپنی دوسری صلاحیتوں کا مرقد بنالیا، لیکن یہ شرف متوسلین محمد ﷺ ہی کو حاصل ہوا کہ نان جویں کھا کر قوت حیدری حاصل کی اور مدرسوں کی زینت بن کر علم و فضل کے چراغ فروزاں کئے، اور راتوں کی عبادت سے روحانیت کی شمعیں روشن کیں اور سلسلۂ رشد و ہدایت جاری کیا اور میدان جہاد میں اتر کر اپنی معاصر دنیا میں استبدادی سامراجوں کا استیصال کر کے انسانیت کے چہرے سے مظلومیت کے آنسو دھوئے اور نظام عدل و مساوات قائم کیا، یہ تھی انسانی فطرت کے تقاضوں کو پورا کرنے اور انہیں تعمیری مقاصد میں انتہائی کامیابی سے استعمال کرنے کی معراج، جو معراج انسانیت ہے اور یہ معراج تو متوسلین محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل ہوئی اس کی مرتبت اور بلندیوں میں ہیچ مخلص کیا ذکر کروں جس پر خدا خود درود بھیجتا ہے اور جس کی بارگاہ میں ملائکہ عقیدت کے پھول چڑھاتے ہیں۔ صلی اللہ علیہ وآلہ واصحابہ وسلم۔

رحمانیہ

سوئیٹس

اینڈ ڈیری

REHMANIA SWEETS & DAIRY

بالمقابل فردوس سینما، ٹھنڈی سڑک۔ حیدرآباد،

فون: 780868

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ط

ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشیؒ ☆

معراجِ انسانیت

یہ حقیقت کہ انسان میں اچھے اور برے رجحانات بیک وقت جمع ہوتے ہیں۔ اس قدر پیش پا افتادہ ہے کہ اس کا اعادہ تحصیل حاصل معلوم ہوتا ہے۔ اس کے باوجود انسان کی فطرت کو سمجھنے کے لئے اسے پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔ نفسیات کے ماہر یہ جانتے ہیں کہ انسان کی جبلت میں تاریک اور تباہ کن خواہشوں کا ایسا اوقیانوس موجزن ہے کہ اگر اس میں قوت احتساب نہ ہوتی تو وحشی درندوں سے بھی زیادہ خوں خوار اور ان تمام خوبیوں سے عاری ہوتا جو انفرادی اجتماعی زندگی کی ضامن ہیں، جس قوت کو میں نے احتساب کہا ہے اس کے لئے انگریزی میں سینسر (Censor) اور اردو میں فوق الشعوری اصطلاح وضع کی گئی ہے۔ یہ احتساب کیا ہے؟ اس کی بنیاد کن عوامل پر قائم ہے؟ اس کی تعمیر کیوں کر ہوتی ہے؟ اس کا فیصلہ کس حد تک قابل قبول ہونا چاہئے؟ یہ کمزور کیوں پڑتا ہے۔ یہ وہ سوال ہیں جو ہر ذی فہم کے ذہن میں ابھرتے ہیں، اور ان کے صحیح جوابوں پر اس کے کردار کی تعمیر ہوتی ہے، یہ ممکن ہے کہ یہ سوال شعوری طور پر قرطاسِ احساس پر منقوش نہ ہوتے ہوں لیکن انسان کا کردار ان ہی سوالوں کے جوابات کا آئینہ دار ہوتا ہے۔

احتساب وہ قوت ہے جو انسانوں کو اپنی خواہشات پر پابندی لگانے پر مجبور کرتی ہے، وہ یہ بتاتی ہے کہ ہر اندھی خواہش پر عمل کرنا نامناسب ہوگا۔ اگر یہ قوت احتساب نہ ہوتی تو اخلاق کا ضابطہ مرتب نہ ہوتا۔ یہ قوت اس طرح پیدا ہوئی ہے کہ انسان اپنے طویل نوعی تجربے کی بنا پر یہ معلوم کر چکا ہے کہ ہر خواہش کی بلا روک ٹوک تکمیل سے انفرادی اور معاشرتی خرابیاں پیدا ہوتی ہیں، اور معاشرے کے انتشار سے وہ وجود

☆۔ سابق وائس چانسلر، جامعہ کراچی

بھی مجروح ہوتا ہے۔اس نوعی تجربے کے علاوہ جو حقیقتاً احتساب کی بنیاد ہے۔ایسے معاشرے کے عقائد و رواج اسے تقویت پہنچاتے ہیں۔جس میں وہ زندہ ہوتا ہے۔اگر یہ بات معقولیت کے ساتھ سمجھ میں آتی ہو کہ احتساب جس بات سے روکتا ہے وہ نوعی سماجی، یا انفرادی معار کے پیش نظر ممنوع ہونی چاہئے۔تو اس فیصلے کو قبول کرنا چاہئے۔

احتساب مسلسل بدعنوانیوں اور بغاوتوں سے کمزور پڑ جاتا ہے۔لیکن احتساب غلطی بھی کرسکتا ہے اگر معاشرہ مریض ہوتو انفرادی احتساب بھی مریض ہو جاتا ہے اور معاشرے کی خرابیوں کے خلاف اس کی قوت مدافعت کمزور پڑ جاتی ہے۔یہی سبب ہے کہ اکثر دانش وروں کی رائے میں ایک ضابطۂ حیات و اخلاق کی ضرورت ہے۔جو احتساب کے لئے کسوٹی کا کام کرے اور اسے صحیح راستے پر چلنے کی ہدایت کرے، جب احتساب ایک ایسے ضابطے کا پابند ہو جاتا ہے جو محض منفی اقدار سے آگے بڑھ کر مثبت قید کی صورت اختیار کر لے تو احتساب اور ضمیر میں ہم آہنگی پیدا ہو جاتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ تربیت یافتہ قوتِ احتساب کا نام ضمیر ہے۔انفرادی اعتبار سے معراج انسانیت یہی ہے کہ انسان خیر کا حامل ہو اور شر سے اس کا دامن پاک ہو، اجتماعی طور پر معراج انسانیت یہ ہے کہ ایک ایسا معاشرہ قائم ہو جو خیر کی ترویج اور شر کی بیخ کنی میں کوشاں ہو اور اس میں کامیابی بھی حاصل کر سکے، کوشش کا ذکر میں نے اس غرض سے کیا ہے کہ بغیر کوشش کے کامیابی حاصل نہیں ہو سکتی اور اگر ایک مرتبہ حاصل ہو بھی جائے تو قائم نہیں رہ سکتی۔وہ تمام خواہشیں اور قوتیں جو انسان کو ودیعت ہوتی ہیں۔ انسانی زندگی میں ایک مقام رکھتی ہیں۔اور کوئی نہ کوئی اہم کردار ادا کرتی ہیں۔وہ اس کی انفرادی اور نوعی زندگی کو برقرار رکھنے کے لئے ضروری ہیں، البتہ ان کے استعمال میں اعتدال شرط ہے اور ان کو کام میں لانے کے لئے بعض حدود مقرر کرنی پڑتی ہیں تا کہ وہ صحیح طور پر بروئے کار آ سکیں۔انسان کی ہر قوت ایک ایسی طاقت ہے جو تعمیر بھی کر سکتی ہے اور تخریب بھی، جو آب حیات بھی ثابت ہو سکتی ہے اور زہر ہلاہل بھی، معراج انسانیت یہی ہے کہ ان سب کو آب حیات بنا کر کام میں لایا جائے۔اب آپ اسلام کے ضابطۂ اخلاق پر نظر ڈالئے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ اس نے انسان کی کسی قوت کو شل کرنے کی ترغیب نہیں دی، بلکہ اس کے استعمال کا ایسا قاعدہ بتایا کہ بہتر سے بہتر خدمت انجام دے سکے۔زندگی میں اس کا وہی کردار ہو جو معاشرے کی تعمیر کے لئے ضروری ہے۔اسلام نے نہ تو اسے ترک کرنے کی تلقین کی جس سے اس کی افادیت ختم ہو جاتی، اور انسانی ذہن کے لئے الجھن اور اس کی

نوعی اور انفرادی زندگی کے لئے مشکلات پیدا ہو جائیں، نہ ایسی چھوٹ دی کہ انفرادی زندگی کا اعتدال اور معاشرے کا استحکام ختم ہو جائے۔ یہ توازن جو اسلام کے ضابطے کی جان ہے اور جو اس ضابطے کو دوسرے ادیان اور ضابطوں پر فوقیت دیتا ہے ایک طرف تو حکمت اور دانش کی معراج ہے، دوسری طرف فطرت شناسی اور رجحانات آگاہی کا کمال ہے۔ اسلام معراج انسانیت کا مفہوم یہ نہیں سمجھتا کہ فرد اپنے آپ کو انفرادی، نوعی اور اجتماعی فرائض سے علیحدہ کر لے، یہی سبب ہے کہ وہ رہبانیت کو مکروہ اور فرار کو ناپسندیدہ قرار دیتا ہے۔ اس کا ضابطہ اس مرد مومن کی تربیت کرتا ہے جس کے لئے زندگی ایک نعمت ہے اور وہ اس کے ذریعے سے ایک مفید اور متوازن معاشرہ بناتا ہے اور پھر اپنی قوت ایمانی اور زور بازو دونوں سے اس کی حفاظت کرتا ہے۔

اس کے نزدیک حیات جدوجہد ہے، کارزار ہے، وہ پوشیدہ اور دانستہ قوتوں کو صحیح استعمال کے ذریعے سے بے دار کرنے اور ان کی تربیت سے جلا پاتی ہے، کمزور نہیں پڑتی۔ جو اس کارزار سے جی چرا کر ہمالیہ کی چوٹیوں یا سماء کے زاویوں میں پناہ لیتا ہے، تو اسلام کا مرد مومن نہیں بن سکتا۔ پھر اسلام اس ازلی راز سے بھی پوری طرح آگاہ ہے کہ فرار سے جو ذہنیت پیدا ہوتی ہے وہ نہ انسانیت کی تعمیر کر سکتی ہے نہ اس کی حفاظت، معراج انسانیت کارزار حیات میں کامیابی کا نام ہے۔ اس کا نشان ظفر فتح مبین ہے۔ یا شہادت ہے، زندگی کو تج دینا اور رہبانیت کے اعلیٰ مقام پر پہنچنا نہیں ہے اور فتح کا ذکر آیا ہے تو فتح کس کے اوپر، جہاد جو اس کارزار کا ایک پرتو ہے وہ جہاد کس کے خلاف؟ مومن کا جہاد شر کے خلاف ہوتا ہے خواہ وہ اپنے نفس میں ہو یا معاشرے میں یا طاغوتی طاقتوں کے استیلا میں یا انسان پر ظلم کی مشکل میں اور ان سب کے خلاف بیک وقت جاری رہتا ہے، ایک ایک کے خلاف علیحدہ علیحدہ باری باری سے نہیں بلکہ بیک وقت اس لئے کہ جہاد تو وہ عبادت ہے جو شرط عبودیت ہے۔ اس سے مومن کسی جگہ منہ نہیں موڑ سکتا۔

نفس کے خلاف جہاد کا صلہ تزکیہ نفس ہے جو تمام دوسری قوتوں کی تقویت کی بنیاد ہے۔
معاشرے میں شر کے مقابلے کا صلہ تطہیر معاشرہ ہے جس کے بغیر انسان کی اجتماعی قوتیں بیدار نہیں ہو سکتیں، طاغوتی قوتوں کا استیلا فرد اور معاشرے دونوں کے لئے پیغام موت ہے اور اس کے خلاف جہاد حیات نو کا پیغام اور اس میں کامیابی کا صلہ انفرادی اور اجتماعی قوتوں کی حیات نو ہے۔ اور ظلم کا مقابلہ ظالم اور مظلوم دونوں کی مجروح انسانیت کا مداوا ہے۔ اس میں کامیابی کا صلہ انصاف اور عدل کا قیام ہے جس کے بغیر انفرادی اور اجتماعی زندگی کے درمیان رشتہ قائم نہیں رہ سکتا۔ اگر اسلام کا ضابطہ اخلاق و کردار حیات انسانی

کی تطہیر وعروج کا ضامن ہے تو وہ ذات گرامی جسے اس ضابطۂ حیات کو سکھانے کے لئے اسوۂ حسنہ بنا کر بھیجا گیا، انسانیت کے کس مقام پر جلوہ افروز ہے، وہ مقام تو وہی ہو سکتا ہے جہاں تک انسان پہنچنے کی برابر کوشش کرے تو قریب تر تو پہنچ سکتا ہے لیکن اس مقام کو حاصل نہیں کر سکتا اس لئے کہ وہ مقام انتہائے عروج ہے، وہ دوسرے انسانوں کے لئے خواہ وہ انبیا ہوں یا اصفیا سمت الرائس عروج تو ہے مقام عروج نہیں وہ معراج معراج ہے محض معراج نہیں، اللہ تعالی کی اس امر میں کیا مصلحت تھی کہ اس نے ایک انسان کو ایسے درجے پر پہنچایا کہ اس کا اتباع معراج انسانیت پر پہنچنے کا زینہ اور اس کے مقام کا صحیح ادراک اصل ایمان ہے، یہ نقطہ فلسفیانہ موشگافیوں سے بالاتر اور عرفان وآگاہی کی حدود میں داخل ہے، اسے صرف تشبیہ اور استعارے کی مدد سے بیان کیا جا سکتا ہے، اور تشبیہ و استعارے کا عجز بھی اہل دانش پر عیاں ہے، بہر حال اسے سمجھنے کے لئے اگر ہر امت کی زندگی کو ایک ندی کے بہاؤ سے مماثل سمجھا جائے تو آسانی ہوگی، اگر وہ ندی دائمی بہنے والی ہے اور محض برساتی نالہ نہیں ہے تو اس کا سرچشمہ بالعموم اس پانی سے زندگی پاتا ہے جو کوہستان کی چوٹیوں پر پڑی ہوئی برف جو پگھل پگھل کر بہم پہنچاتی ہے جب یہ ندی اپنے منبع سے روانہ ہوتی ہے تو اس کا پانی شفاف اور آلودگیوں سے پاک ہوتا ہے۔ اس میں ایک جوش ہوتا ہے جو پتھروں کو توڑتا اور گھستا ہوا ایک شور وخروش کے ساتھ بہتا ہے، اس وقت اسکی دلفریبی دیکھنے کے قابل ہوتی ہے وہ اپنا راستہ پہاڑوں اور وادیوں میں بناتی ہوئی چٹانوں سے ٹکراتی ہوئی، پتھروں سے اٹکھیلیاں کرتی ہوئی چھوٹے بڑے سنگریزوں کو جلا کرتی ہوئی بالآخر مسطح علاقے میں پہنچ جاتی ہے اور پھر اس کی رفتار میں سکون پیدا ہوتا ہے۔ وہ اپنے دامن کو دوسری ندیوں اور نالوں کے لئے فراخ رکھتی ہے اور وہ آکر اس میں ملتے ہیں اور اس کی قوت کو بڑھاتے ہیں۔ جب تک یہ نالے صاف پانی لاتے ہیں ندی کا پانی مکدر نہیں ہوتا، لیکن پھر اس کو ایسے مقامات سے بھی گزرنا پڑتا ہے جہاں اسے بیسیوں خطرات درپیش ہوتے ہیں، مگر دو خطرے ایسے ہیں جن سے ندی کی افادیت کم ہو جاتی ہے۔ پہلا خطرہ تو یہ ہے کہ وہ کسی ایسے علاقے میں پہنچ جائے جہاں مزید ندی نالوں کی کمک نہ مل سکے اور ریگستان میں خشک ہوتے ہوتے اس کا وجود ہی ختم ہو جائے، اور دوسرا خطرہ یہ ہے کہ وہ ایسے علاقے سے گزرے جس کی کثافتیں اس کے پانی کی شیرینی اور صفائی کو ختم کر دیں یہ خطرے ان ندیوں کو زیادہ پیش آتے ہیں جو کسی نیچے پہاڑ سے نکلتی ہیں، جہاں برف کی مقدار کم ہو اور یہ مقدار اس کی کفیل نہ ہو سکے کہ اسے کثافت وقلت آب کی بلاؤں سے بچا سکے، ندی کا پانی ہی اصل میں اس کی حیات ہے، اب آپ دنیا کی ان امتوں پر نظر ڈالئے جن کی زندگی کا سرچشمہ کم از کم ابتداءً ہدایت الہٰی تھا، کوئی بھی

کر اپنی تنگ مائیگی کے سبب کسی ریگستان میں جا کر معدوم ہو گئی، اور کوئی خارجی اثرات کی کثافتوں کی تاب نہ لا سکی، لیکن امت محمدیہ (ﷺ) کو چونکہ انسانیت و نبوت کی سب سے اونچی چوٹی سے آب حیات کی رسد پہنچتی رہی اس لئے وہ ریگستانوں کو گلزار بناتی ہوئی ان سے آگے نکل گئی اور اس کی تعلیمات کا سرچشمہ چونکہ وحی کے شفاف اور خالص ضابطے سے سیراب ہوا تھا اس لئے اگر ماحول کی کثافت نے اس پر غلبہ پانے کی کوشش بھی کی تو کامیاب نہیں ہوئی۔ غور فرمایئے کہ وہ کونسا دین ہے جس کی تعلیمات کا انحصار ایسی کتاب پر ہے جس میں لوح محفوظ پر ثبت ہونے سے آج تک یعنی ازل سے ابد کے اس نقطے تک جہاں آج انسانیت پہنچی ہے ایک نقطے کی تحریف نہ ہوئی ہو، یہ آب حیات ہم تک ایسی بلندترین ہستی کے طفیل ہی پہنچ سکتا تھا جس کا درجہ تمام انبیا علیہم السلام میں سب سے بلند ہے یہ مقام تو تمام انبیا کی تعلیمات کے تقابل سے ظاہر ہوتا ہے، دنیاوی فلسفیوں کی کیا مجال ہے کہ اس بلند مقام پر پہنچیں جہاں انبیاءؑ کی مشیت الٰہی کے ماتحت نہ پہنچ سکے۔

فلسفہ تو اپنے لنگ پا کی وجہ سے ایسی الجھنوں میں گرفتار رہا ہے کہ اس سے خود فلسفیوں کی بھی تشفی نہیں ہوتی اور اگر کسی ناقص فلسفے پر کسی معاشرے کی عمارت کھڑی بھی کی گئی تو اسے قائم رکھنے کے لئے بنیادی فلسفے میں روزافزوں تبدیلیوں اور تحریف کی ضرورت پیش آتی رہی۔

انسانی سیرت کے تین پہلو ہوتے ہیں جو اس کے ترکیب و تخلیق میں داخل ہیں ایک یہ کہ وہ اس عالم آب و گل میں ایک حیوان ہے جس دنیاوی زندگی کا انحصار اس کی مادی ضروریات کی تکمیل پر ہے۔ دوسرا یہ کہ وہ حیوان ناطق ہے جس کے باعث اس میں فکرو دانش کی صلاحیتیں مضمر ہیں اور جو نوعی تجربے اور تحقیقات کی بنیاد پر وسیع تر ہوتی جاتی ہیں، تیسرا یہ کہ یہ پیکر خاکی نوری تجلیات کا مورد بھی ہے، اور اس کی روح میں وہ تشنگی ہے جو نہ مادی ضروریات کے پورا ہونے سے بجھتی ہے نہ عقل و دانش کے عروج سے رفع ہوتی ہے، ابتدائے آفرینش سے آج تک اس نے یہ کوشش کی ہے کہ اس مادی ماحول سے ماورا کی کیفیات سے اپنے دامن کو بھر لے، یعنی انسان کی زندگی کو جسمانی، ذہنی، روحانی ضروریات پر مشتمل سمجھنا چاہئے اور ان تینوں کو جدا کرنا ایسا ہی ہے کہ گوشت کو پوست سے یا رگ جان کو جسم سے علیحدہ کر کے زندگی کے جاری رہنے کی امید رکھی جائے، جو عروج انسانی کی دسترس میں اب تک رہا ہے، وہ انہی تین طبقات سے متعلق رہا ہے، کوئی اگر جسمانی قوئی کی تربیت سے مشہور ہوا تو رستم داستاں بنا اور اگر کسی نے ذہنی ترقی کی تو وہ سقراط یا افلاطون یا ابن سینا کی ہمسری کا مدعی ہوا، کسی نے روحانی ترقی کی تو اس نے ریشیوں منیو کے آسن یا عزلت

نشین رہبانیت کے بورے پر بیٹھ کر نفس کشی کی منزلیں طے کیں اور اپنے جسم کو اپنی دوسری صلاحیتوں کا مرقد بنالیا، لیکن یہ شرف متوسلین محمد ﷺ ہی کو حاصل ہوا کہ ان جویں کھا کر قوت حیدری حاصل کی اور مدرسوں کی زینت بن کر علم و فضل کے چراغ فروزاں کئے، اور راتوں کی عبادت سے روحانیت کی شمعیں روشن کیں اور سلسلۂ رشد و ہدایت جاری کیا اور میدان جہاد میں اتر کر اپنی معاصر دنیا میں استبدادی سامراجوں کا استیصال کر کے انسانیت کے چہرے سے مظلومیت کے آنسو دھوئے اور نظام عدل و مساوات قائم کیا، یہ تھی انسانی فطرت کے تقاضوں کو پورا کرنے اور انہیں تعمیری مقاصد میں انتہائی کامیابی سے استعمال کرنے کی معراج، جو معراج انسانیت ہے اور یہ معراج تو متوسلین محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل ہوئی اس کی مرتبت اور بلندیوں میں ہیچ مجھ کیا ذکر کروں جس پر خدا خود درود بھیجتا ہے اور جس کی بارگاہ میں ملائکہ عقیدت کے پھول چڑھاتے ہیں۔ صلی اللہ علیہ وآلہ واصحابہ وسلم۔

رحمانیہ

سوئیٹس اینڈ ڈیری

REHMANIA SWEETS & DAIRY

بالمقابل فردوس سینما، ٹھنڈی سڑک۔ حیدرآباد،

فون: 780868